

اقبال کا تصور عمل اور دُعا

طالب حسین سیال ☆

سید نذیر نیازی اپنی کتاب بعنوان ” اقبال کے حضور“ میں ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء کے دن کی روئیداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

” حضرت علامہ اپنی علالت پر تبصرہ کرنے لگے۔۔۔۔۔ عوارض سے علاج اور علاج سے سلسلہ گفتگو دوا کی طرف پھر گیا اور دوا سے دعا کی طرف۔ حضرت علامہ نے فرمایا ” دُعا کے بارے میں سر سید احمد خان اور مرزا صاحب (بانی سلسلہ احمدیہ) نے انتہا کر دی۔ سید احمد خان پر تو علت و معلول کا خیال اس درجہ غالب تھا کہ اُس وقت کے علوم طبیعی کے زیر اثر انہوں نے ”نچر“ کا جو تصور قائم کیا اُس کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ حادث کی ترتیب میں کوئی رد و بدل ہو سکے یا اُن سے وہ نتیجہ مترتب نہ ہو جس کا باعتبار علت و معلول مترتب ہونا ضروری ہے لہذا وہ بار بار ”نچر“ کا نام لیتے اور پھر اس کے اس حد تک قائل ہو گئے کہ انہوں نے سمجھا کائنات کے جملہ حادثات علت و معلول کی کڑی زنجیر میں اس سختی سے منسلک ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کا ظہور یقینی ہے۔ اب فرض کیجئے حادثہ الف رونما ہے اور یہ حادثہ کسی دوسرے مثلاً حادثہ ب کی علت ہے تو بحیثیت معلول حادثہ ب کا ظہور گویا پہلے سے متعین ہو چکا ہے، لہذا حادثہ وقوع میں آئے گا اور ضرور آئے گا۔ یہ ”نچر“ ہے اور نچر کی کارفرمائی رک سکتی ہے نہ اسے کوئی روک سکتا ہے ”نچر اپنا کام کرتا رہے گا۔ حادثہ کی ترتیب علت و معلول کی پابند ہے اور اس میں رد و بدل ناممکن۔ یہ گویا امر ربی ہے۔ یوں سر سید کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دعا سے بجز تسکین قلب اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مرزا صاحب تھے، جن کا کہنا تھا کہ دعا سے سب کچھ ممکن ہے۔ آپ دعا کرتے جاپیئے، جو چاہتے ہیں ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک بڑا مسئلہ اس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی حادثے کی توجیہ یہ سمجھ کر کر لی جاتی ہے کہ وہ نتیجہ ہے قبولیت دعا کا تو ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا ہوگا۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ دعا کی جاتی تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ اسے بہر کیف پیش آنا تھا، اس لئے کہ حادثہ ماقبل کا رخ اسی جانب تھا۔ لہذا پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ حادثہ کی

ترتیب میں کیا رد و بدل ممکن ہے؟ کیا دعا اس ترتیب کو روک سکتی ہے؟ میں نے عرض کیا: کیا حادثہ کی کوئی ترتیب بھی ہے؟ ارشاد ہوا: علت و معلول کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کی ترتیب ہو، ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی۔۔۔۔ حضرت علامہ نے فرمایا: وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق تو نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اسی سے کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھ ہی سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ زندگی کیا ہے؟ ایک مسلسل دعا! (۱)

دعا کا تصور خدا یا غیر مرئی قوتوں دیوی اور دیوتاؤں کے تصور سے منسلک ہے۔ یہ بحث پرانی ہے کہ دعا انسان کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے یا دعا کا سبب خارجی خطرات و آفات ہیں؟ دعا تقویت قلب اور شرح صدر ہے یا فریب نفس؟ دعا، عزم و ہمت کی تجدید و توثیق ہے یا انسانی بے بسی، احساس تنہائی اور بے چارگی کی مظہر ہے؟ کیا سلسلہ امور کسی ایک برتر قوت کے تابع ہے یا کئی غیر مرئی طاقتیں اور اوتار وغیرہ سلسلہ امور کو چلاتے ہیں یا اپنے امور چلانے پر انسان کلی طور پر مختار ہے؟ کیا خدا محض ایک لامحدود انرجی ہے؟ آفاقی تعقل اور کائناتی نظم کا نام خدا ہے یا خدا ایک عظیم و بصیر اور سمجھ جاوید ہستی ہے جس کا کائنات سے ماوراء بھی اپنا ایک شخص ہے؟

مذہبی کتب، تاریخی آثار اور قیاس اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عہد قدیم ہی سے انسان ایک برتر قوت اور کائنات میں یا اس سے ماوراء ایک عظیم ہستی کا قائل رہا ہے چونکہ فطرت کے بارے میں ابھی اُس کا علم بہت کم تھا وہ مظاہر فطرت میں ربوبیت دیکھتا تھا۔ اسی لئے حضرت انسان درختوں، سانپوں، ستاروں، چاند اور سورج کی پرستش کرنے لگا۔ ان کے علاوہ وہ کئی خیالی اور افسانوی ہستیوں کو بھی ماننے لگا جو اُس کے خیال کے مطابق اُس کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر تھیں ان غیر مرئی ہستیوں کو وہ دیوی اور دیوتا کے ناموں سے پکارتا تھا۔ کئی طاقتور اور غیر معمولی قسم کے انسانوں کو بھی اوتار کا درجہ دے دیا گیا اور اُن کی پرستش بھی شروع ہوگئی۔ انسان کی مظاہر پرستی، بت پرستی اور اوتار پرستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان فطرت کے قوانین سے واقف نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوا تھا کہ خارجی خطرات اور قدرتی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکے۔ اس لئے وہ اپنی بے بسی اور جہالت کے باعث کبھی سورج کی پرستش کرتا، کبھی چاند اور ستاروں سے اپنی قسمت وابستہ کر لیتا اور کبھی پتھر کے بتوں کے سامنے جھکتا، اُن سے اپنی مرادیں مانگتا۔ مختلف التجائیں کرتا، قربانی اور نذر و نیاز پیش کرتا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ قدیم دور، خوف اور ڈر سے عبارت تھا اور انسان صرف دعاؤں اور التجاؤں پر انحصار کرتا تھا۔ ہرگز نہیں انسان شروع ہی سے متجسس تھا اور

وہ جدوجہد اور پیکار میں بھی لگا رہا۔ وہ دوحش کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر ہتھیار تیار کرنے لگا۔ قدرتی آفات اور موسمی سختیوں سے بچاؤ کی تدابیر بھی سوچتا رہا اور اپنائے جنس سے لڑتا بھی رہا اور استفادہ علم و تجربہ بھی کرتا رہا۔

مذہبی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ روئے زمین پر پہلے نام خدا انسان یعنی حضرت آدمؑ کو علم دیا گیا۔ وہ معرفت خدا رکھتے تھے اور وہ پہلے پیغمبر تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ بت پرستی اور مظاہر پرستی کے دور میں انبیاء نے توحید کا سبق دیا اور اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کو واضح کیا۔ قدیم تہذیبوں کے ادوار میں اگرچہ اکثریت شرک اور بت پرستی کی طرف مائل تھی لیکن چند اہل نظر ان ادوار میں بھی تھے جو ایک خدا یا ایک برتر قوت کے قائل تھے۔ قدیم تہذیبوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ خدا کے بارے میں حکماء کے دو مکاتب فکر رہے ہیں۔ جن حکماء کا نظم و ضبط، امن و امان اور سکون و سرور کی طرف زیادہ دھیان تھا، انہوں نے خدا کے بارے میں یہ تصور قائم کر لیا کہ خدا کائنات کا ایک آرڈر (Order) ہے۔ کائنات میں جو تنظیم اور ربط و ضبط ہے وہی خدا ہے۔ چونکہ کائنات عقلی لحاظ سے مربوط، منظم اور متوازن ہے اور کرہ ارض حیات آفرین اور حیات پرور ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ خدا اسی کائنات کے اندر جاری و ساری قوت ہے۔ اس کا خارج میں کوئی شخصی وجود محال ہے یا بالفاظ دیگر کائنات میں کارفرما قوانین فطرت کا دوسرا نام خدائی طاقت ہے۔ کائنات کا نظام قوانین فطرت میں جکڑا ہوا ہے۔ اس نظام کی منطق اور ترتیب کو دریافت تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ قدیم یونانی اور ہندی حکمت میں اسی قسم کے تصورات ملتے ہیں۔ ان دونوں فلسفوں میں فرد کی بجائے نظام کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ہندومت میں کامل اور مطلق سکون کی خاطر، فرد کو اپنا وجود مٹانا پڑتا ہے۔ قدیم یونانی حکماء بھی غیر متغیر اور مثالی سکون کی تلاش میں تھے۔ ہندو حکماء اور اہل باطن کے نزدیک دعا اور عبادت کی کوئی اہمیت نہیں یہ رسومات Rituals صرف عوام کی تسلی کے لئے ہیں۔ نجات کا اصل راستہ آخری آتما میں ضم ہونا ہے۔ اسلامی تہذیب، نظام اور فرد دونوں کو اہم گردانتی ہے۔ اس تہذیب میں فرد کو انفرادیت اور آزادی حاصل ہے لیکن وہ ذمہ دار اور مسئول بھی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا اس کائنات کا خالق اور مالک ہے لیکن اس نے انسان کو بے پناہ طاقت اور صلاحیت بخشی ہے اور وہ اس دنیا میں اپنا مقام خود بنا سکتا ہے اور اس کائنات کی حالت کو بدل سکتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام شخصی خدا کے تصور کے مبلغ تھے۔ واضح بات ہے کہ جب خدا ایک شخصیت ہے، وہ پوری کائنات پر محیط ہے، وہ ذرے ذرے کا علم رکھتا ہے، وہ دیکھتا اور سنتا ہے تو ایسا خدا اس دنیا سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور انہیں

قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل، زبور اور قرآن حکیم میں کئی انبیاء کی دعائیں موجود ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری اور خطبات میں جا بجا شخصی خدا کے تصور پر اپنے یقین کا اظہار کیا ہے اس لئے اقبال دعا مانگنے اور دعا کے اثرات کے قائل تھے بلکہ وہ دعا کو جزد ایمان سمجھتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ قرآن حکیم کی باقاعدہ تلاوت کرتے تھے اور نماز (جو دعا کی ایک جامع شکل ہے) کی اہمیت کے قائل تھے۔ اُن کے بچپن کے اعجاز احمد روایت کرتے ہیں:

”۱۹۲۳ء کی گرمیوں کا ذکر ہے عدالت عالیہ کی تعطیل میں چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ اُس سال کے شروع میں انہیں نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی تھی۔۔۔۔۔ سحر خیزی کے آداب تو چچا جان سے لندن میں بھی نہ چھوٹے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی بیدار ہو گئے۔ مجھے اپنے اگوٹھے پرلٹ کی گدی رکھے بیٹھے دیکھا تو اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ پر رکھا اور دباتے ہوئے فرمایا: ”ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد“ پھر پوچھا تمہاری چچی کہاں ہے؟ میں نے کہا وضو کے لئے غسل خانے گئی ہیں۔ پوچھا اذان ہوگئی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا تم نماز کے لئے نہیں گئے۔ مجھے عداوت سے اعتراف ہے کہ باوجود اُن کے اس ارشاد کے کہ ”جہاں تک ممکن ہو نماز میں باقاعدہ ہو جاؤ“ اُن دنوں میری نمازیں گنڈے دار تھیں۔ کبھی پڑھ لی۔ کبھی نہ پڑھی۔ اس غفلت کا اعتراف اُن سے کرنے میں تامل ہوا۔ بات ٹالنے کے لئے کہا جو کچھ کر رہا ہوں یہ بھی تو عبادت ہی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ”نہیں! نماز کو اولیت حاصل ہے۔ درد میں اب تخفیف ہے تم اٹھ کر نماز ادا کرو۔“ میں نے ارشاد کی تعمیل کی (۲)۔

دعا اور عمل کی بحث میں ایک دلچسپ پہلو اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں انسان نے سائنس میں ترقی کی اتنا ہی وہ عمل کا زیادہ قائل ہوتا چلا گیا اور دعا کی اہمیت اس کے ذہن سے گھٹی چلی گئی۔ سائنس نے انسان کو اعتماد اور قوت بخشی اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کائنات میں ایک فعال عنصر ہے۔ وہ روئے زمین کا نقشہ بدل سکتا ہے، وہ فضاؤں اور سمندروں پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے۔ سائنس کے نکتہ نظر سے زندگی کا نظام اعمال سے ہی چلتا ہے اس میں دعا اور کسی خدا سے التجا کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سائنس، مادی ذرائع اور طبی قوانین پر انحصار کرتی ہے۔ سائنس کے نکتہ نظر سے بارشیں جغرافیائی محل وقوع، جنگلات اور موسمی عوامل پر منحصر ہوتی ہیں۔ استقاء کی دعا سے ہم فصل کے علاقے کو چراپونجی نہیں بنا سکتے۔ دعاؤں اور مناجات

کے ذریعے ہم آسٹریلیا کی بارشوں کو صحراؤں اور ریگستانوں میں نہیں لا سکتے۔ سائنس کے ذریعے انسان فطرت کے رازوں سے واقف ہو گیا ہے اور اسے پتا چل گیا ہے کہ بارش اور طوفان کے کیا اسباب ہوتے ہیں؟ اس لئے اب وہ آسانی بجلی سے نہیں ڈرتا، چاند گرہن اور سورج گرہن سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ موجودہ سائنس نے عمل کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کر دیا ہے بلکہ میں یوں کہوں گا کہ موجودہ سائنسی علوم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ طبیعی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں اور مادی حالات کو انسان صرف اپنے عمل سے بدل سکتا ہے۔

بحث کے اس مرحلے پر ایک معرکتہ لا آرا پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ قوانین فطرت کو بدلنے یا قوانین فطرت کے خلاف کوئی واقعہ رونما کرنے پر قادر ہے؟ جمہور مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوانین فطرت کی عموماً خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن جب وہ چاہتا ہے وہ معمولات فطرت کو بدل دیتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے لیکن آگ، ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور اُن کے لئے سراپا سلامتی بن جاتی ہے۔ ضربِ کلیم سے پتھر پٹی چٹان سے بارہ چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان معجزات کو وسیع اور ذومعنی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اُن اسباق اور پیغام کو بے حجاب کرتے ہیں جو ان معجزات میں مضمر ہیں۔ اقبال ان معجزات کے حوالے سے عالم بشریت کی قوتوں کو منکشف کر کے اعلیٰ انسانوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان اب بھی ان احوال کی چکاچوند سے گزر سکتا ہے اور ان کے فیوض و برکات سے معاشرے کو نئی حرارت اور نئی قوت بخش سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا
 ("جواب شکوہ"، بانگِ درا)

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر
 بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!
 (ضربِ کلیم)

اقبال فطرت (Nature) کو کردارِ الہی کا نام دیتے ہیں۔ وہ استقرائی عمل سے فطرت اور ماحول کو مسخر کرنے اور انسانی خدمات کے لئے اس میں تصرف کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں:

”وہ (انسان) اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو صرف عقل استقرائی کی بدولت لیکن عقل

استقرائی اُس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے“ (۳)۔

انسانی جذبات ، ایمانیات اور روحانیت کے شعبے تک سائنس کی رسائی نہیں اور یہ وہ دنیا ہے جہاں خدا اور بندے کے تعلق اور انسانوں کے باہمی تعلقات کے معاملات زیرِ بحث آتے ہیں۔ دعا کے ذریعے اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اس لئے ہر مذہب میں اللہ سے مناجات کرنے کے لئے مختلف دعائیں اور عبادت کی کئی شکلیں ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے حقوق و فرائض کے لئے عالمی مذاہب نے بالخصوص دین اسلام نے بنیادی اصول و احکام عطا کئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اسلام میں استخراجی طرزِ فکر بھی ہے اور استقرائی طرز بھی ہے۔ اسلام طبعی علوم کا بھی قائل ہے اور ایمانیات اور روحانیت میں وحی الہی کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اقبال اپنے خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں :

”مضمیرِ اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے یہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن یہ اعتبار اُس کی روح دنیائے جدید سے ، یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کا آئندہ رخ کے عین مطابق تھے لہذا اسلام کا ظہور ----- استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ لہذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آکر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر یہ نکتہ مضمیر ہے کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے ، جو باعتبار نوعیت انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے“ (۳)۔

اقبال شد و مد سے عمل کی تلقین کرتے ہیں وہ ان لوگوں کو روحِ اسلام سے بیگانہ قرار دیتے ہیں جو دعا و صلوة کو محض رسومِ Rituals کی حیثیت سے سرانجام دیتے ہیں۔ وہ نماز کے مقاصد اور عملی اسباق سے محروم رہتے ہیں۔

تیرا امام بے حضور ، تیری نماز بے سرور ایسی نماز سے گذر ، ایسے امام سے گذرا
(بال جبریل)

اقبال اس عالم کو روزِ محشر کہتے ہیں جہاں صرف عمل کی قدر و قیمت ہے ، فرماتے ہیں :
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
("زندگی" ، بانگِ درا)

یہاں اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی مفکرِ عظیم انسان اور انسان کی بے پناہ
صلاحیتوں کا قائل ہوگا وہ ہمیشہ یہ دعوت دے گا کہ انسان اپنے عمل اور اپنی کوشش سے اپنا مقدر سنوار
سکتا ہے اور اس جہاں کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے ۔ اس قسم کے مفکرین کو عمل سے ہی فرصت
نہیں ہوتی اُن کا عمل ہی اُن کی دعا ہوتی ہے ۔ " جب چینی مفکر کنفیوشس بسزِ علالت پر پڑے تھے
اُن کے شاگرد Tzu Lu نے کہا کہ میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں ۔ کنفیوشس نے سوالیہ انداز
میں کہا یہ دعا کیا ہوتی ہے ؟ (کیا اس سے کچھ فرق پڑتا ہے) میری ساری زندگی سراپا دعا ہے (۵)

آئیے ! اب ذرا تفصیل سے اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شعری اور نثری زبان
میں بار بار عمل اور جدوجہد کی طرف توجہ کیوں مبذول کرائی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں
کہ اُن کے نزدیک دُعا کا حقیقی مقصد اور غایت کیا ہے ؟ کوئی بھی مفکر اپنے ماحول اور دور سے بے
نیاز نہیں ہو سکتا۔ شاعر اپنے عصر کی روح سے گہرا اثر قبول کرتا ہے ۔ وہ مفکر جو شاعری کو انسان کی
خدمت اور اعلیٰ و ارفع مقاصدِ حیات کی ترویج کے لئے ایک ذریعہ تصور کرتا ہے وہ اپنے عصری
حالات اور تقاضوں کا تجزیہ کر کے اپنے قریبی حلقوں کو بالخصوص اور پوری نوع انسان کو بالعموم ایک
پیغام دیتا ہے ۔ اقبال کا زمانہ یورپ کے سیاسی تفوق اور علمی عروج کا زمانہ تھا۔ اہل یورپ نے اپنی
محنت، مہم جوئی اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کی بدولت ایشیاء اور افریقہ کے کئی ملکوں کو اپنا
غلام اور محکوم بنا لیا تھا۔ محکوم قوموں میں ذہنی پستی اور بے بسی بڑھتی جا رہی تھی ۔ برصغیر ہندوپاک
جہاں مسلمانوں نے سات سو سال تک حکومت کی تھی ۔ وہاں مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے
ہوئے تھے۔ وہ معاشی لحاظ سے غریب سیاسی لحاظ سے بے اثر اور ذہنی طور پر خلفشار اور پراگندگی کا
شکار تھے۔ اقبال اہل وطن کا حال دیکھ کر بہت رنجیدہ خاطر ہوتے تھے ۔ وہ اُن کے انحطاط کے
اسباب جان چکے تھے اور ان میں سب سے بڑا سبب اہل ہند کی بے عملی اور سہل پسندی تھی ۔ اقبال

نے ان مایوس اور بے عمل لوگوں کو زندگی اور عمل کی تعلیم دی۔ اُن کا روئے سخن تین قسم کے لوگوں کی طرف تھا۔ اولاً: تقدیر پرست لوگ۔ یہ حضرات اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ نظام کائنات پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔ دولت، رزق، بیماری، صحت، خوشی اور غم، محبت اور دشمنی، آفات و حادثات کے بارے میں پہلے ہی سے فیصلے ہو چکے ہیں۔ انسان قسمت کے ان فیصلوں کو بدلنے پر قادر نہیں۔ اس لئے اگر ہماری قسمت میں غلامی اور ذلت ہے تو ہم تقدیر کے اس اٹل فیصلے سے چمٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں خواہ مخواہ دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے اور تقدیر کی مسلط کی ہوئی ذلت اور رسوائی کو قبول کر لینا چاہیے۔ یہ لوگ اس نظریے کی تبلیغ کرتے تھے کہ ہم اپنی کوششوں سے تقدیر کو نہیں بدل سکتے ہاں اگر جب کبھی تقدیر میں ہمارے حالات کا سنورنا لکھا ہوگا تو وہ خود بہ خود سنور جائیں گے۔ ثانیاً: وہ لوگ جو اس پر یقین رکھتے تھے کہ کائنات کا نظام غیر مرئی اور خفیہ طاقتیں چلا رہی ہیں۔ ان کو اگر خوش رکھا جائے تو زندگی میں کامیابی اور خوشی ملتی رہتی ہے اور اگر یہ طاقتیں ناراض ہو جائیں تو برے دن آجاتے ہیں۔ یہ طاقتیں انسان کی اچھائی اور برائی پر کھل صرف رکھتی ہیں۔ اس لئے مختلف دعاؤں، پوجا پاٹ، نذرو نیاز، منتروں اور قربانی ایسے طریقوں سے ان طاقتوں کو خوش رکھنا چاہیے۔ اس قسم کے اعتقادات عام ہندوؤں اور توہم پرست مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک عمل کی ثانوی حیثیت ہے۔ اس لئے یہ لوگ سادھوؤں، بکشوؤں اور بیروں فقیروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ان سے اپنے مسائل حل کرانے اور اپنے کام سنوارنے کی درخواستیں کرتے رہتے ہیں۔ کئی لوگ تو اعلیٰ عہدوں کی طلب یا ان پر قائم رہنے کے لئے بھی مخفی طاقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ باطن کی دنیا میں بھی اقتدار کا ایک نظام ہے اور باطن میں مقدر ہستیاں ظاہری اقتدار پر نصب و عزل کے متعلق فیصلے صادر کرتی ہیں۔ ثالثاً: وہ لوگ اور قومیں جو اپنے آپ کو خدا کے لاڈلے اور چہیتے سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ انسان ہیں اور دنیا کے باقی لوگ خدا کی رحمت سے دور ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدا ان کا طرفدار ہے وہ اس دنیا میں ان کی مدد و نصرت کرتا ہے۔ ان کے اعتقادات کو تائید خداوندی حاصل ہے۔ اگر وہ کسی دوسری قوم یا فرد سے مقابلہ کریں گے تو خدا ان کا طرفدار ہوگا۔ یہ حضرات اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتے، اپنے مادی وسائل کا جائزہ نہیں لیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ ہیں اور خدا ہر حال میں اُن کا ساتھ دے گا۔ عہد رسالت میں قرآن حکیم نے اس قسم کا رویہ رکھنے والے لوگوں کے احوال کو بیان کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بارے میں کہا گیا ہے:

و قالوا لن نؤمن بالله عندا فلن یخلف الله عهدہ ام

تقولون علی اللہ ما لا تعلمون O بلی من کسب سینة و احاطت به خطیبتہ فاولئک
اصحاب النار O

” وہ کہتے تھے کہ ہمیں آگ نہیں چھوئے گی بجز چند دنوں کے۔ کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ وہ اُس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ یا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ہاں کیوں نہیں! جس نے بھی برائیاں کمائیں اور اُس کی خطاؤں نے اُس کا احاطہ کر لیا ایسے تمام لوگ اصحاب النار ہیں۔“ (البقرہ ۲، آیات ۸۰، ۸۱)

اسی سورۃ میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :

وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان هوذا او نصری تلک امانیہم قل ہاتوا برہان کم ان
کنتم صدقین O (بقرہ ۲، آیت ۱۱۱)

” وہ کہتے تھے کہ جنت میں یہود و نصری کے علاوہ کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔ یہ اُن کی محض خواہشات ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو واضح دلیل لاؤ۔“

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے دور سے اس قسم کے خیالات کچھ مسلمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی حیات دنیا کی طرف توجہ نہیں دیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت کی زندگی میں آرام، راحتیں اور کامیابیاں اُن کے لئے مختص ہیں۔ وہ اجتماعی زندگی کے تقاضوں اور محنت و سعی کے شعبوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے لئے صوم و صلوة کا اجر و ثواب ہی کافی ہے، آخرت میں اُن کا ٹھکانہ جنت ہے اور وہ اُن کی دائمی زندگی ہے۔

اقبال چشم بصیرت سے یہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اُن کا علمی جمود، فکری بانجھ پن اور اُن کی عیش پسندی اور تن آسانی ہے۔ دور انحطاط میں وہ کئی روحانی و ذہنی بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ وہ تصوف خفہ کی طرف مائل ہو گئے۔ اُن کی ادبیات یاس و قنوطیت مستی و خود فراموشی سے معمور ہوتی چلی گئیں۔ اُن کے علاء فضلاء فروغی اور زندگی سے لاطلق مسائل میں تعلق کرنے لگے۔ اجتماعی معاملات اُن کے فکھ اور بحث کے موضوعات نہ رہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ معاشرے کی علمی و روحانی قیادت کرنے والے حلقے خود بھی بے عمل ہو گئے اور وہ بے عملی کی تبلیغ بھی کرنے لگے۔ اقبال نے اس افسوسناک حالت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ صوفی کی طریقت میں مستی احوال ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار! وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا بلاشبہ عبادات میں شامل ہیں لیکن ان سے مشکل تر عبادات رزق حلال کے لئے سعی کرنا، عناصر پر حکمرانی کرنا اور معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ انسان نامہ خدا کی حیثیت سے عناصر پر حکمرانی کرنے اور اس دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس کا کام محض تسبیح و تہلیل نہیں ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

نہ کر تھلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی تن آسان عرشوں کو ذکر و تسبیح و طواف ادائی

(بال جبرئیل)

جو قوم بھی عمل سے غافل ہو جائے اس کی تقدیر میں پستی اور غلامی ہے چاہے وہ قوم شب و روز تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور خدا سے الحاح و انکسار کے ساتھ دعائیں مانگتی رہے۔ محض دعاؤں سے نہ تو کھیت میں بل چلتے ہیں۔ نہ فصلیں ہری بھری ہوتی ہیں نہ ہی سیلابوں اور قدرتی آفات پر قابو پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی معدنیات دریافت ہوتی ہیں اور نہ ہی برق و بخار پر تصرف حاصل ہوتا ہے نہ ہی ملک اور قوم دولت مند ہوتے ہیں۔ خوشحالی، ترقی اور غلبہ باہمت، ولولہ خیز اور محنتی لوگوں کا مقدر ہے۔ تاریخ بے عمل قوموں کو معاف نہیں کرتی۔ اقبال فرماتے ہیں:

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپائی

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی براں صفت تیغ دوپیکر نظر اس کی

(ضرب کلیم)

اقبال نے نہ صرف فلسفہ و حکمت اور ادبیات عالم کا مطالعہ کیا تھا بلکہ انہیں تاریخ عالم سے گہرا شغف تھا اور انہوں نے اپنے تاریخی شعور سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اہل یورپ کی ترقی بالخصوص انگریزوں کی ترقی ان کی عملیت پسندی کا ثمر ہے۔ تاریخی واقعات کے اسباب و علل ہوتے ہیں۔ تاریخ محض اتفاقات کا نام نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو سمجھنے کے سلسلے میں اقبال انگریزوں کا بطور خاص ذکر

کرتے ہیں۔ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں ” مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اس وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لئے اُن کے ادبیات و تخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔۔۔۔۔۔ جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لئے مختص حواس ہیں اسی طرح انسانوں میں ایک حاسہ بھی ہے جس کو ”حسِ واقعات“ کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعات گرد و پیش کے مشاہدہ کرنے اور اُن کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے۔۔۔۔۔۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں ”حسِ واقعات“ اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔۔۔۔۔۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ اُن سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں“ (۶)۔

قرآنی بصیرت اور تاریخ کی روشنی میں اقبال کا یہ پیغام ہے کہ وہ فرد یا قوم کامیاب اور طاقت ور ہوتے ہیں جو عملِ پیہم پر یقین رکھتے ہیں اور ایک لمحہ بھی جدوجہد کے بغیر نہیں گزارتے۔ اقبال کے نزدیک فرد یا قوم کی کامیابی کا میزان ایام نہیں بلکہ معیارِ حیات اُس قوم کے کارنامے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات تیری میزان ہے شمارِ سحر و شامِ ابھی

(بانگِ درا)

اقبال کا پیغام ہے کہ حرکت اور محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کائنات متحرک ہے اور کرۂ ارض پر نہ صرف موسم بدلتے رہتے ہیں بلکہ نباتات، طیور و وحوش اور حیوانات سب اپنی جبلتوں اور ضرورتوں کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ یہ سب فطرت کے اشارے ہیں انسان کے لئے جو کہ مقصودِ کائنات ہے اور اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کے لئے حرکت و عمل بدرجہ اولیٰ ضروری ہے کیونکہ اس نے نائبِ خدا کی حیثیت سے ایک طرف کائنات کے نظام کو چلانا ہے۔ یعنی فطرت کو سحر کرنا ہے اور باقی مخلوقات پر اپنی افضلیت کو ثابت کرنا ہے اور دوسری طرف ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنا ہے۔ ان دونوں وظائف کے لئے انسان کی مدد کے لئے کوئی غیر مرئی مخلوق نہیں ہے اس نے اپنی مدد آپ کرنا ہے۔ فطرت کی مخالف قوتوں سے خود ٹکرانا ہے۔ زلزلوں، بیماریوں اور دیگر آفات سے خود نمٹنا اور ان پر قابو پانا ہے بلکہ بحیثیت انسان اپنی تخریبی اور متنی قوتوں کو بھی زیر کرنا ہے یہ سب کام محض تمناؤں اور دعاؤں سے سرانجام نہیں پا سکتے۔ اس کے لئے تازہ

افکار، نئے نئے تجربات مسلسل کوشش اور انتھک محنت اور غیر مختتم عمل کی ضرورت ہے جب انسان یہ سب کچھ کر گزرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نوید سناتے ہیں :

انی لا اضع عمل عامل منکم من ذکر او انشی O (سورۃ آل عمران، آیت ۱۹۵)
 ”بے شک میں تم میں سے کسی عامل کے عمل کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت ، ضائع نہیں کرتا۔۔۔۔۔“

اقبال نے کس جامع اور دل نشیں انداز میں پیغام عمل دیا ہے۔ فرماتے ہیں :

یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فلاحِ عالم جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
 (بانگِ درا)

اقبال اس شعر میں محبت کو فلاحِ عالم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عالم کو جنگ سے فتح نہیں کیا جا سکتا بلکہ محبت اور حسنِ اخلاق سے انسانوں کو اپنا گرویدہ بنایا جا سکتا ہے۔ قوت اور طاقت سے کسی کے خیالات کو بدلا نہیں جا سکتا۔ عسکری قوت سے کسی قوم کو زیادہ عرصے تک محکوم نہیں رکھا جا سکتا بلکہ دلوں کو فتح کرنے کے لئے اعلیٰ اخلاق ، رواداری اور فکر و عمل کی بلندی درکار ہوتی ہے۔ کوئی قوم اپنے حسنِ عمل سے دوسری قوموں کو متاثر کر سکتی ہے۔ اقبال نے ان مشرقی اور مغربی علماء کو پسند کیا ہے جن کے کلام میں عمل و حرکت پر زور ہے۔ انہوں نے ان حکماء اور شعراء کے کلام سے بچنے کی تلقین کی ہے جن کے ظننے اور شاعری میں سکون و سرور مایوسی اور خود فراموشی کا سامان ہے۔ اقبال نے اس شعر میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ پوری زندگی جدوجہد اور عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ پوری زندگی جہاد ہے جس میں ہمیشہ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت سے ترقی و کامیابی کے راستے طے ہوتے ہیں۔

اقبال مسلمانوں کو جب سعی و عمل کی دعوت دیتے ہیں تو ان کے سامنے اُسوۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جدوجہد اور ثبات و استقلال سے عبارت ہے۔ آپ کی حیات طیبہ حسنِ عمل کی تفسیر ہے۔ آپ کی عملی زندگی یہ درس دیتی ہے کہ تدبیر و عمل کے بعد دُعا کا مرحلہ آتا ہے۔ پہلے اپنے وسائل کو مومنانہ فراست کے ساتھ بروئے کار لائیے اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیے۔ دعا مانگنے اور اس کی قبولیت کے لئے بھی کئی شرائط ہیں۔ ایک مشہور حدیث نقل کی جاتی ہے:

الرجل يطيل السفر اشعث اغبر يمد يده الى السماء يا رب يا رب ومطعمه حرام و مشربه حرام و ملبسه حرام و غذى بالحرام فاتى يستجاب لذلك (صحیح مسلم)

” ایک شخص جو دور دراز سفر میں ہو اس کا چہرہ غبار آلود ہو اور پریشانی و پراگندگی کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہے یعنی دعا کرے۔ حالانکہ اُس کا کھانا، پینا اور پہناوا حرام ہو اور وہ حرام کماٹی ہی صرف میں لاتا ہو تو اُس کی دعا قبول کیسے ہو؟“

دعا اور عمل کے حوالے سے دو مشہور غزوات کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جو نہایت ہی سبق آموز ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام بدر پر جنگ کی حکمت عملی سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں بھی رہنمائی فرمائی ”طریقہ جنگ کے بارے میں ایک خصوصی رہنمائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب مشرکین ہتکھنہ کر کے تمہارے قریب آجائیں تو اُن پر تیر چلانا اور اپنے تیر بچانے کی کوشش کرنا (یعنی پہلے سے فضول تیر اندازی کر کے تیروں کو ضائع نہ کرنا) اور جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں تلوار نہ کھینچنا۔۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف درست کر کے واپس آتے ہی اپنے پاک پروردگار سے نصرت و مدد کا وعدہ پورا کرنے کی دعا مانگنے لگے۔ آپ کی دعا یہ تھی:

اللهم انجزني ما وعدتني اللهم انشدك عهدك ووعدك O

” اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا فرما دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے عہد اور تیرے وعدے کا سوال کر رہا ہوں۔“

پھر جب گھمسان کی جنگ شروع ہوئی، نہایت زور کا رن پڑا اور لڑائی شباب پر آگئی تو آپ نے یہ دعا فرمائی:

اللهم ان تهلك هذه العصابة اليوم لا تعبد O اللهم ان شئت لم تعبد بعد اليوم ابداً O

” اے اللہ! اگر آج یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی، اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے۔۔۔۔۔“

آپ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ آپ پُر جوش طور پر آگے بڑھ رہے تھے اور فرماتے جا رہے تھے:

”سيهزم الجمع ويولون الدبر O (۳۵:۵۴)“

”عنقریب یہ جتھہ شکست کھا جائے گا اور پیٹھے پھیر کر بھاگے گا“۔ (۷)

پانوں کے بیچ میں پڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نو صحابہ کی ذرا جتنی نفری کے ہمراہ پیچھے تشریف فرما تھے۔۔۔۔۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو آپ اپنے نو رفقاء سمیت تیزی سے بھاگ کر کسی محفوظ جگہ چلے جاتے اور اپنے لشکر کو جو اب نرنے میں آیا ہی چاہتا تھا اُس کی قسمت پر چھوڑ دیتے یا اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے صحابہ کو بلا تے۔۔۔۔۔ ایک مضبوط محاذ تشکیل دیتے۔۔۔۔۔ آزمائش کے اس نازک ترین موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبقریت اور بے نظیر شجاعت نمایاں ہوئی۔ کیونکہ آپ نے جان بچا کر بھاگنے کی بجائے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر صحابہ کرام کی جان بچانے کا فیصلہ کیا۔۔۔۔۔ عین اُس وقت جبکہ اسلامی لشکر نرنے میں آ کر مشرکین کی چکی کے دو پانوں کے درمیان پس رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گرد بھی خون ریز معرکہ آرائی جاری تھی۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنا تابڑ توڑ حملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز رکھا۔۔۔۔۔ اس حملے میں عقبہ بن ابی وقاص نے آپ کو پتھر مارا جس سے آپ پہلو کے بل گر گئے۔ آپ کا داہنا نچلا رباہی دانت ٹوٹ گیا اور آپ کا نچلا ہونٹ زخمی ہو گیا اور اڑیل سوار عبداللہ بن شہاب زہری نے آگے بڑھ کر آپ کی پیشانی زخمی کر دی۔ ایک اڑیل سوار عبداللہ بن قثمہ نے لپک کر آپ کے کندھوں پر ایسی سخت تلوار ماری کہ آپ ایک مہینے سے زیادہ عرصے تک اُس کی تکلیف محسوس کرتے رہے البتہ آپ کی دہری زرہ نہ کٹ سکی۔ اس کے بعد اُس نے پہلے ہی کی طرح پھر ایک زور دار تلوار ماری۔ جو آنکھ سے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈی پر لگی اور اس کی وجہ سے خود کی دو کڑیاں چہرے کے اندر دھنس گئیں ساتھ ہی اُس نے کہا: ”اسے لے، میں قثمہ (توڑنے والے) کا بیٹا ہوں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے فرمایا: ”اللہ تجھے توڑ دے۔“

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آپ کا رباہی دانت توڑ دیا گیا اور سر زخمی کر دیا گیا۔ اس وقت آپ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جا رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے: ”وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے کے چہرے کو زخمی کر دیا اور اُس کا دانت توڑ دیا حالانکہ وہ انہیں اللہ کی طرف دعوت دے رہا تھا اس پر اللہ عز و جل نے یہ آیت نازل فرمائی:

لیس لك من الامر شیء او یتوب علیہم او یعذبہم فانہم ظلمون O (۱۲۸:۳)

”آپ کو کوئی اختیار نہیں اللہ چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دے اور چاہے تو عذاب دے

کہ وہ ظالم ہیں (۷)۔“

صحیح مسلم کی روایت میں بھی یہی ہے کہ آپؐ بار بار کہہ رہے تھے۔

رب اغفر لقومی فانہم لا یعلمون O

”اے پروردگار! میری قوم کو بخش دے۔ وہ نہیں جانتی۔“

قاضی عیاض کی شفا میں یہ الفاظ ہیں۔

اللہم اهد قومی فانہم لا یعلمون O

”اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ وہ نہیں جانتی۔“

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیا انہوں نے جم کر لڑائی کی۔ وہاں پر موجود باقی صحابہ کرام نے بھی بے مثال جان بازی و سرفروشی کے ساتھ دفاع اور حملہ کیا جس سے بلا آخر اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی صفیں چیر کر نرنے میں آتے ہوئے صحابہ کرام کی جانب راستہ بنائیں۔ چنانچہ آپؐ نے قدم آگے بڑھایا اور صحابہ کرام کی جانب تشریف لائے۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپؐ کو پہچانا۔ خوشی سے چیخ پڑے ، مسلمانو! خوش ہو جاؤ۔ یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ خاموش رہو۔ تاکہ مشرکین کو آپؐ کی موجودگی اور مقام موجودگی کا پتا نہ لگ سکے۔۔۔ مگر اُن کی آواز مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ مسلمان آپؐ کی پناہ میں آنا شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ تیس صحابہ جمع ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اس طرح کی جان بازی اور جان سپاری کے ساتھ یہ دستہ منظم طور سے پیچھے ہٹتا ہوا پہاڑ کی گھاٹی میں واقع کیپ تک جا پہنچا اور بقیہ لشکر کے لئے بھی اس محفوظ مقام تک پہنچنے کا راستہ بنا دیا۔ چنانچہ باقی ماندہ لشکر بھی آپؐ کے پاس آ گیا اور حضرت خالدؓ کی فوجی عبقریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی عبقریت کے سامنے ناکام ہو گئی“ (۸)۔

اندازہ لگائیے کہ چالیس تیر اندازوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو کس قدر نقصان ہوا اور کس قدر تکالیف اٹھانی پڑیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو جماعت جبکہ احد میں لڑ رہی تھی وہ تقویٰ، راست بازی اور تعلق باللہ میں اپنی مثال آپ تھی۔ عالمگیر اور آفاقی معیار کے مطابق بھی یہ جماعت روئے زمین پر سب سے بڑھ کر راست باز افراد پر مشتمل تھی لیکن چالیس افراد کی

غلطی ، کوتاہی اور حب مال کی وجہ سے پوری جماعت کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ پیغمبر خدا اور صحابہ کرام کا مددگار نہ تھا؟ کیا تخلصین کی اس جماعت پر رحمت خداوندی سایہ نکلن نہ تھی؟ اس قسم کے سوالات کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل میں مضمر ہے۔ آپؐ نے جس دانشمندی اور استقلال کے ساتھ بحران کی اس حالت میں اپنی فوج کی کمان کی وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپؐ نے حالات کا گہری نظر سے تجزیہ کر کے ہر آنے والے لمحے کو عمل کا لمحہ بنا دیا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک اپنی تدبیر ، حکمت عملی اور قائدانہ صلاحیت کی بدولت احد میں تیر امدادوں کی غفلت کی تلافی نہیں کی اور کفار مکہ کی دست برد سے مدینے کو محفوظ نہیں کر لیا۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اُس وقت تک حالت جنگ میں رہے جب تک آپؐ کو یقین نہیں ہو گیا کہ کفار لڑائی کا ارادہ ترک کر کے مکہ کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ رسالت مآبؐ کی فراست ، قیادت ، قوت ارادی اور سعی و عمل پر یقین کا اندازہ اس طرز عمل سے ہوتا ہے جو آپؐ نے احد والے دن جنگ کے خاتمے کے بعد اختیار فرمایا۔ مارٹن لنگو اس طرح منظر کشی کرتے ہیں :

” جب وہ (مسلمان) شہر میں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور جونہی وہ مسجد میں پہنچے انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام کرنے کے لئے لیٹے اور اس قدر گہری نیند سو گئے کہ وہ بلال کی عشاء کی اذان نہ سن سکے اور جب جاگے تو اپنے گھر میں ہی عشاء پڑھ لی۔ انصاریوں کے سعدین (سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ) اور اوس اور خزرج کے دیگر زعماء ساری رات باپ مسجد پر پہرہ دیتے رہے کیونکہ قریش کے واپس لوٹنے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے دن نماز فجر ادا کرنے کے بعد پیغمبر اسلام نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ دشمن کا ضرور تعاقب کرنا ہے اور ہمارے ساتھ ان اشخاص کے علاوہ جو کہ کل کے دن جنگ میں ہمارے ساتھ موجود تھے ، کوئی اور ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔۔۔۔۔ اگرچہ احد کے میدان میں مسلمانوں کے کثیر افراد زخموں سے چور تھے۔ انہوں نے اپنے زخموں پر جہاں تک ممکن تھا مرہم پٹیاں باندھیں اور دوبارہ رواگی کے لئے تیار ہو گئے۔۔۔۔۔ پیغمبر خدا اگرچہ اپنے داہنے کندھے کو مشکل سے ہلا سکتے تھے سب سے پہلے تیار ہو گئے۔ جب حضرت طلحہؓ رواگی کا وقت پوچھنے کے لئے آئے تو آپؐ اس وقت باپ مسجد کے قریب گھوڑے پر سوار نظر آئے اور اتنے زخم ان کے جسم پر تھے کہ ان کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ وہ معذور تھے لیکن وہ رواگی کے ارادے سے اپنے گھر چلے گئے۔ لشکر اسلام نے پہلا پڑاؤ مدینے سے آٹھ میل دور ڈالا۔ اس وقت دشمن ”رواہ“ کے مقام پر

خیمہ زن تھا جو زیادہ دور نہ تھا۔ پیغمبر اسلام نے اپنے اطاعت گزاروں کو حکم دیا کہ وہ ایک وسیع علاقے میں پھیل جائیں اور زیادہ سے زیادہ لکڑیاں اکٹھی کریں اور ہر شخص اپنے سامنے لکڑیوں کا ایک الگ بندوق رکھے چنانچہ سورج غروب ہونے تک انہوں نے تقریباً پانچ سو ایندھن کے نمایاں ڈھیر تیار کر لئے اور رات ہوتے ہی ہر شخص نے اپنے ڈھیر کو آگ دکھا دی شعلے دور اور وسیع مقامات سے نظر آتے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہاں ایک بہت بڑی فوج خیمہ زن ہے۔۔۔۔۔ کچھ قریشی واپس آ کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے منفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ سب رفتاری کے ساتھ مکہ روانہ ہو جائیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے وہاں سوموار، منگل اور بدھ تین دن اپنے اپنے خیموں میں گزارے اور ہر رات وہ آگ کے الاؤ روشن کرتے تھے۔ حالانکہ ان دنوں میں ان کو آرام اور نگہداشت کی سخت ضرورت تھی۔ جمعرات کو وہ مدینہ واپس لوٹ آئے“ (۹)۔

علامہ اقبال قرآن کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ کی روشنی سے مستعیر ہو کر اپنے خطبات میں بار بار اس سچائی کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے دیکھنے، سننے اور غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ گویا اسلام پہلے انسان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعے دیکھے اور عقل سلیم کی بنیاد پر حیات دنیوی کو خوبصورت، آسودہ، محفوظ اور خوب تر بنائے۔ اس نکتہ نظر سے اقبال سائنسی اصولوں کی روشنی میں عمل اور سعی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ سائنس کی رُو سے کائنات کا نظام علت و معلول کے سلسلے میں منسلک نظر آتا ہے۔ سائنس کے نکتہ نظر سے دُعا اور اس کے اثرات کی توجیہ نہیں کی جا سکتی کیونکہ دعا ایک روحانی عمل ہے جو مادیت سے بالا تر ہے۔ بندے اور خدا کے تعلق کے معاملے میں سائنس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اقبال مذہب کے عزائم کو سائنس اور فلسفے سے بلند تر سمجھتے ہیں۔ امریکن نفسیات دان پرڈیسیر ویلیم جیمز کی اس عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ دعا انسان کی جبلت میں داخل ہے۔

”سائنس کچھ بھی کہے، مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے، دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا، الا یہ کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے، مگر جس کا جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے امکان نہیں۔ دراصل دعا کو تحریک ہوتی ہے تو اس لئے کہ اختیار انفس انسانی کے اگرچہ کئی مراتب ہیں، بایں ہمہ اس کی تہوں میں ایک نفس اجتماعی پوشیدہ ہے جسے اپنا سچا ہدم (رفیق اعلیٰ) کسی مثالی دنیا ہی میں مل سکتا ہے۔۔۔۔۔ لہذا کتنے انسان ہیں جو ہمیشہ نہیں تو اکثر اس ہدم صادق کی تمنا اپنے سینوں میں لئے پھرتے ہیں اور جس کی بدولت ایک حقیر سا انسان بھی جسے بظاہر لوگوں نے دھتکار رکھا ہو محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہستی بھی اپنی جگہ پر

کچھ ہے۔ یہ اندرونی سہارا نہ ہو تو ان حالتوں میں جب ہمارا نفس اجتماعی ناکام ہو کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، دنیا بہتوں کے لئے جہنم بن جائے۔ میں کہتا ہوں بہتوں کے لئے، کیونکہ جہاں تک یہ احساس کہ ایک اعلیٰ و ارفع ہستی ہمارے اعمال و افعال کو دیکھ رہی ہے، بعض لوگوں میں تو بڑا قوی ہوگا، بعض میں خفیف۔ گو بعض طبیعتوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ان میں یہ احساس بہ نسبت دوسروں کے زیادہ شدت کے ساتھ جاگزیں ہو۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ جتنا یہ احساس کسی دل میں قوی ہوگا اتنا ہی مذہب سے اسے زیادہ گہرا لگاؤ ہوگا۔ لیکن پھر اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، کیونکہ تھوڑا ہو یا بہت، یہ احساس ان کے اندر بھی موجود ہوگا۔“ (۱۰)

علامہ اقبال قرآنی آیات کی روشنی میں دعا کی تجلیات کے قائل تھے۔ وہ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں :

” باعتبارِ نفسیات دعا یا عبادت ایک جبلی امر ہے اور پھر جہاں تک حصولِ علم (معرفت) کا تعلق ہے۔ ہم اسے غور و فکر سے مشابہ ٹھہرائیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا درجہ غور و فکر سے کہیں اونچا ہے مگر پھر غور و فکر کی طرح وہ بھی تحصیل و اکتساب ہی کا ایک عمل ہے، جو بحالتِ دعا ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور کچھ ایسی طاقت اور قوت حاصل کر لیتا ہے جو فکر محض کو حاصل نہیں۔ فکر کی حالت میں تو ہمارا ذہن حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے اعمال و افعال پر نظر رکھتا ہے لیکن دعا کی صورت میں وہ ایک آہستہ گام کلیت کی منزل بہ منزل راہنمائی کو چھوڑ کر فکر سے آگے بڑھتا اور حقیقتِ مطلقہ پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یوں بالارادہ اس کی زندگی میں حصہ لے سکے۔۔۔۔۔۔ دعا بھی ایک حیاتی عمل ہے جس میں ہم ذہناً محسوس کرتے ہیں کہ ہماری بے نام سی شخصیت کی جگہ بھی کسی بہت بڑی اور وسیع تر زندگی میں ہے۔۔۔۔۔۔“

لہذا دعا خواہ انفرادی ہو خواہ جمعی ضمیرِ انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف و تجسس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالبِ حقیقت کے لئے نفی ذات ہی کا لمحہ اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں سچ سچ ایک فعال عنصر کی ہے۔“ (۱۱)۔

دعا کا تعلق مذہب یا نفسیاتِ انسان سے ہے۔ تاریخِ انسانی یہ بتاتی ہے کہ ہر معاشرے اور ہر

قوم میں دعا مانگنے کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور رہا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں اگرچہ کچھ اشخاص اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دعا سے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن وہ بھی رواجاً دعا مانگ لیتے ہیں۔ بحیثیت انسان کبھی اُن کے دل بھی اداس ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے دل میں کسی برتر ہستی کے وجود کی روشنی محسوس کرتے ہیں۔ دعا چاہت و عقیدت کا اظہار ہے۔ دعا ایک پکار ہے مدد کے لئے، طلبِ رحمت کے لئے، توجہ اور التفات کے لئے۔ دعا اپنے حزن و غم کے بیان سے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا نام ہے۔ دعا کا اصل مقصد یادِ الہی اور قربِ الہی ہے۔ بندہ اپنے خدا کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر اس کی حمد کرتا ہے۔ اس کی کبریائی بیان کرتا ہے۔ اس کے سامنے جھک کر اس کی تعظیم بجا لاتا ہے اور سجدہ ریزیوں سے اس کی علو شان کا اقرار و اعلان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ حبِ الہی کے مظاہر ہیں۔ بندے اور خدا کے باہمی تعلق کی علامت اور صورتیں ہیں، محبت کا یہ تعلق دو طرفہ ہوتا ہے اور یہی دوستی کا مسلک ہے۔ جب بندہ اللہ کے اسمائے حسنة سے اسے پکارتا ہے۔ اس کی شانِ ربوبیت کے تصور سے سرشار ہو کر اس کا شکر گزار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس بندے کو یاد کرتا ہے اور یاد رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولا تکفرون O (البقرہ ۲، آیت ۱۵۲)

”پس یاد رکھو تم مجھے، میں یاد رکھوں گا تمہیں اور شکر گزار بنو میرے اور نہ کرو نا شکری میری“

نماز مکمل اور جامع دعا کی شکل ہے اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واقم الصلوٰۃ لذكوری (طہ ۲۰، آیت ۱۶)

”اور نماز قائم کرو، میری یاد کے لئے“۔

دعا کا یہ مفہوم نہیں کہ عمل سے دست بردار ہو جائیں اور نہ ہی دعا، بے عملی کا مداوا ہے۔ نتائجِ عمل سے پیدا ہوتے ہیں دعا جذبہٴ عمل کو ابھارتی ہے، دعا، اعمال کی کوتاہیوں کو دور کرنے کا عمل ہے۔ بے عمل انسان کی دعا کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ علامہ اقبال انسان کے عمل کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ بقول اُن کے کائنات کی ہر شے میں دمِ خم اور زیب و زینت انسان کے دمِ قدم سے ہے۔ انسان کی ان تھک محنت اور جدوجہد سے عالمِ رنگ و بو آباد ہے اور اس میں ہر لمحہ نئی چیزیں معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ انسان اپنے اندازِ عمل سے نئے جہاں تخلیق کرتا ہے اور زندگی کو نئی تفسیر اور اپنے ارادوں کو نئی تعبیریں بخش رہا ہے۔ اسرارِ خودی میں اپنی نظم ”نیلِ الہی“ میں فرماتے ہیں:

زندگی بظہد ز اعجازِ عمل می کند تجدید اندازِ عمل
 جلوہ ہا خیزد ز نفسِ پائے او صد کلیم آوارۂ سینائے طور
 زندگی را می کند تفسیر او میدہ این خواب را تعبیر نو

اقبال بنیادی طور پر جہد و عمل اور تجدید عمل کے مفکر ہیں لیکن وہ دعا کے منکر بھی نہیں ہیں۔ وہ دعا کو قربِ الہی، تقویتِ قلب اور تقویتِ عمل کا باعث سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ بندہ دعا کے تصور کے بغیر اپنی ہستی کو پہچان نہیں سکتا اور عمل کے بغیر مقاماتِ خودی طے نہیں کر سکتا۔ دعا اور عمل انسان کو لامحدود ہستی کی نو بہ نو تجلیات سے منسلک کرتی ہے۔ اقبال بندے کی پکار اور خدا کے جواب کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطابِ آخر، اٹھتے ہیں حجابِ آخر
 احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا سوز و تب و تاب اول۔ سوز و تب و تاب آخر!
 میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ ام کیا ہے شمشیر و سناں اول، طاؤس و ربابِ آخر
 تھا ضبط بہت مشکل اس سبیلِ معافی کا کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتابِ آخر
 اقبال کے مندرجہ بالا اشعار قرآن کی اس آیت کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں:

و اذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی
 ولیؤمنوا بی لعلہم یرشدون O (البقرہ ۲، آیت ۱۸۶)

” اور جب پوچھیں تم سے میرے بارے میں تو بے شک میں تو قریب ہی ہوں، جواب دیتا ہوں میں پکارنے والے کی پکار کا، جب پکارتا ہے وہ مجھے، تو چاہیے کہ وہ مجھے جواب دیں (حکم مائیں میرا) اور یقین رکھیں مجھ پر تاکہ وہ راہِ راست پالیں۔“

حوالہ جات

- ۱۔ نذیر نیازی سید، ”اقبال کے حضور“، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۵۹ تا ۳۶۱
- ۲۔ اعجاز احمد، ”مظلوم اقبال“، شیخ شوکت علی پرنٹرز ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹
- ۳۔ اقبال محمد شیخ، ”تفکیر جدید الہیات اسلامیہ“، مترجم نذیر نیازی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۹۲۔
وضاحت کے لئے ملاحظہ کریں:

"Nature is to the Divine Self as Character is to the Human Self"

("The Reconstruction of Religious Thought in Islam", Page 56)

"Inductive reason, which alone makes man master of his environment, is an achievement; and when once born it must be reinforced by inhibiting the growth of other modes of knowledge."

("The Reconstruction of Religious Thought in Islam", Page 126)

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۳-۱۹۴۔ اس کا اصل متن یہ ہے :

"Looking at the matter from this point of view, then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that in order to achieve full self-consciousness man must finally be thrown back on his own resources. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality. The idea, however, does not mean that mystic experience, which qualitatively does not differ from the experience of the prophet, has now ceased to exist as a vital fact, Indeed the Quran regards both 'Anfus' (self) and 'Afaq' (world) as sources of knowledge."

("The Reconstruction of Religious Thought in Islam", Page 126,127)

- ۵۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا انجوز، Analects کی کتابی شکل میں موجود ہے اس کے انگریزی ترجمہ کو ۱۹۹۷-۲-۹ کو update کیا گیا، اس کی نقل انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ صفحہ 51 ملاحظہ کیجئے۔
- ۶۔ عبدالواحد سید معینی، ”مقالات اقبال“، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸
- ۷۔ صفی الرحمن مبارکپوری، ”الرحیق المختوم“، دارالکتب الشافیہ، شیش محل روڈ لاہور، ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۶
- ۸۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۷ تا ۳۷۳
- ۹۔ Martin Lings, "Muhammad", George Allen & Unwin, London, Page195,

196

- ۱۰۔ اقبال محمد شیخ، ”تفکیل جدید الہیات اسلامیہ“، مترجم نذیر نیازی، بلاغ اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۳۳

"It seems probable that in spite of all that science may do to the contrary, men will continue to pray to the end of time, unless their mental nature changes in a manner which nothing we know should lead us to accept. The impulse to pray is a necessary consequence of the fact that whilst the innermost of the empirical self of a man is a self of the social sort it yet can find its only adequate socius (its "great companion") in an ideal world Most men, either continually or occasionally, carry a reference to it in their breasts. The humblest outcast on this earth can feel himself to be real and valid by means of this higher recognition. And, on the other hand, for most of us, a world with no such inner rfuge when the outer social self failed and dropped from us would be the abyss of horror. I say "for most of us," because it is probable that men differ a good deal in the degree in which they are haunted by this sense of an ideal spectator. It is a much more essential part of the consciousness of some men than others. Those who have the most of it are possibly the most religious men. But I am sure that even those who say they are altogether without it deceive themselves, and really have it in some degree."

("The Reconstruction of Religious Thought in Islam", Page 89)

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵، ۱۳۶

ادارہ تحقیقات اسلامی کی منفرد علمی پیشکش

مسلم معاشرہ کی تاسیس و تشکیل

ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمن

قیمت: 125.00 روپے

صفحات: 234

زیر نظر کتاب میں صدر اسلام کے سیاسی، سماجی، معاشی اداروں کی تاسیس و تشکیل کا دور جاہلیت کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے، اور اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے کن کن شعبوں کو متاثر کیا۔ ماضی کے کن عناصر کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا اور کن عناصر کو مہلت حیات دی۔ بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں کس طرح ایک خدا پرستانہ معاشرہ کی داغ بیل ڈالی گئی جو اپنے اصولوں کے بارے میں کسی مصالحت کا روادار نہ تھا۔ اس نے اقدار و تصورات کی نئی دنیا تشکیل دیتے ہوئے انسانی فکر و عمل کے منہاج میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور دور جاہلیت کے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں سے کہاں کہاں اور کس طرح استفادہ کیا۔

کتاب یہ جاننے میں مدد دیتی ہے کہ مسلم معاشرہ ارتقائی منازل طے کرنے کے سفر میں غیر مسلم معاشروں سے کس حد تک استفادہ کر سکتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ڈپٹی ڈائریکٹر مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی)

پوسٹ بکس نمبر 1035۔ اسلام آباد 44000۔ فون نمبر 254874